کشمیر: ایک منظر نامہ

کمال احمد صدیقی

यात्रा
YATRA BOOKS

PENGUIN BOOKS

DS
485
.K27

YATRA BOOKS
203, Ashadeep, 9 Hailey Road, New Delhi-110001

پینگوئن بکس
پبلیشر۔پینگوئن گروپ

PENGUIN BOOKS
Published by the Penguin Group
Penguin Books India Pvt. Ltd, 11, Community Centre, Panchsheel Park, New Delhi 110017, India
Penguin Group (USA) Inc., 375 Hudson Street, New York, NY 10014, USA
Penguin Group (Canada), 90 Eglinton Avenue East, Suite 700, Toronto, Ontario, M4P 2Y3, Canada (a division of Pearson Penguin Canada Inc.)
Penguin Books Ltd, 80 Strand, London WC2R 0RL, England
Penguin Ireland, 25 St Stephen's Green, Dublin 2, Ireland (a division of Penguin Books Ltd)
Penguin Group (Australia), 250 Camberwell Road, Camberwell, Victoria 3124, Australia (a division of Pearson Australia Group Pty Ltd)
Penguin Group (NZ), 67 Apollo Drive, Rosedale, North Shore 0632, New Zealand (a division of Pearson New Zealand Ltd)
Penguin Group (South Africa) (Pty) Ltd, 24 Sturdee Avenue, Rosebank, Johannesburg 2196, South Africa

Penguin Books Ltd, Registered Offices: 80 Strand, London WC2R 0RL, England

First published in Urdu by Penguin Books India, Yatra Books 2008
Kashmir: Ek Manzarnama Copyright © Kamal Ahmed Siddiqi 2008
Introduction Copyright © Mushirul Hasan 2008

All rights reserved
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

Typeset by K. A. Nomani
Printed at Chaman Offset Printers, New Delhi

اس کتاب کو بغیر پبلشر کی تحریری اجازت کے، کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر (جس میں اس کا کور ڈیزائن، بائنڈنگ وغیرہ شامل ہے) نہ تو بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہی کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔ اس کی اشاعت کا کوئی بھی حصہ دوبارہ نقل نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی اسٹور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بانٹا جا سکتا ہے۔ کسی بھی طور پر جیسے فوٹو کاپی کرنا ہو یا اس پر پروگرام بنایا جانا ہو، یا اس کی آڈیو، ویڈیو ریکارڈنگ ہونی ہو، ان سب کے لئے ہر حال میں تحریری اجازت لینی ضروری ہے۔ اس کے کاپی رائٹ مالک سے اور اس کے پبلیشر سے بھی۔

انتساب

کشمیر، اور اہلِ کشمیر کے نام:

حسن وہ حسن کہ جس حسن کو آئے نہ زوال
اور فردا ہے وہ فردا کہ جو ماضی ہے، نہ حال

پیش لفظ

اس کتاب کے مصنف کمال احمد صدیقی کو کس زمرے میں رکھا جائے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ادب کے زمرے میں انھیں یقیناً رکھا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ آٹھ نو برس کی عمر میں باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں طرحی مشاعروں کا دستور تھا اور وہ کچی عمر میں طرحی مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ چند برسوں میں ہی غزل سے اوب گئے اور نظمیں بھی کہنے لگے۔ پھر کہانیاں بھی لکھنے لگے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی نظم ساقی (دہلی) جیسے مؤقر رسالے میں جون 1944 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ سیّد رفیق حسین (مص آئینہ حیرت)، ان کے نانا خواجہ سلیمان مرزا کے بھانجے تھے۔ کمالؔ سے کوئی چالیس برس بڑے تھے، لیکن انھوں نے ہم پلّہ اور ہم رتبہ بنانے کے لیے نہ صرف برج اور فلیش کھیلنے کی تربیت دی، بلکہ حقّہ، سگریٹ اور بیڑی پینے پر لگایا۔ ٹالسٹائے کا کلمہ پڑھتے تھے۔ کمالؔ کو کہانی وہ رموز سکھائے، جن میں سے کچھ سے آج بھی فکشن کے ماہرین آشنا نہیں۔ کمالؔ نے کہانیاں بھی لکھیں، جو 1943 سے لاہور اور دلّی کے مؤقر رسائل میں چھپیں، عالمگیر (لاہور) اور خیام (لاہور) کے علاوہ نرالہ اور شاعر (آگرہ) وغیرہ میں بھی

کہانیاں چھپیں۔ نظمیں ساقی کے علاوہ لاہور کے ادب لطیف، ادبی دنیا، ہمایوں، کتاب وغیرہ میں بھی شائع ہوئیں اور تقسیم ملک سے پہلے مکتبہ اردو اور مکتبہ جدید کے سالانہ انتخابات میں شائع ہوئیں۔ نیا دور (بنگلور) اور (کراچی) نے خاص اہتمام سے ان کی طول نظمیں چھاپیں۔ ساقی میں تو، تقسیم برّصغیر سے پہلے تک ہر شمارے میں کمال کی ایک آزاد نظم ضرور شامل ہوئی تھی۔ کمالؔ نے اس توجہ سے اعتراف کے طور پر اپنے پہلے مجموعے بادباںؔ کو سیّد رفیق حسین اور شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) کے ناموں سے 1948ء میں معنون کیا۔ اردو میں صرف آزاد نظموں میں مشتمل بادباںؔ پہلی کتاب ہے۔ 1948ء میں نیا دور (کراچی) کے ایڈیٹر صمد شاہین نے دستخطی اداریے میں اس وقت تک کی جدید اردو شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا، اور ان ادوار کی ابتداء فیض احمد فیضؔ، اختر الایمان اور کمال احمد صدیقی سے کی۔

1949ء میں کمال احمد صدیقی دلّی آگئے، اور اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ مکتبہ جامعہ کے بورڈ نے انھیں مکتبہ میں کتابوں اور نئی روشنی (ہفتہ وار) کی اشاعت دیکھنے کا کام سونپا۔ 26 رجنوری 1950ء کا یوم جمہوریہ پر خاص نمبر انھوں نے رنگین سرورق کے ساتھ نکالا۔ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن تپ دق نے انھیں آدبوچا۔ عابد صاحب اور رفیع احمد قدوائی کی تحریک پر ان کے علاج کا بندوبست کشمیر کے سینا ٹوریم میں ہوگیا۔ اور کشمیر میں خواجہ غلام محمد صادق نے انھیں بلوالیا۔ بلٹز کے آخری صفحہ پر خواجہ احمد عباس کی تحریر پڑھ کر، اور ڈاکٹر رشید جہاں کے ایک خط کے جواب میں۔ دو برس علاج کے ساتھ ساتھ وہ کشمیر پر پڑھتے اور لکھتے رہے۔ یہ تحریریں رسائل میں چھپتی تھیں اور کچھ ریڈیو کشمیر سے براڈ کاسٹ ہوتی تھیں۔ براڈ کاسٹنگ کے واجبات سے وہ

واقف تھے، کیونکہ 1943ء سے وہ لکھنؤ سے براڈ کاسٹ بھی کرتے رہتے تھے۔ سینا ٹوریم سے باہر آئے تو ریڈیو کشمیر نے انھیں ایڈیٹر کی ذمہ داریاں دیں، اور پروگرام لکھنے کے علاوہ موسیقی کا شعبہ بھی سپرد کر دیا۔ کچھ ڈرامے فیچر، خاص طور سے ہندوستان کے دریا سلسلے میں جھیلم کے مآخذ، روایت اور ماقبل تاریخ سے عہدِ حاضر تک، نیل متھ پران سے بیسویں صدی تک وادیٔ کشمیر کی تاریخ، علمی، سماجی اور تاریخی زاویوں سے حقائق کے بازآفرینی پر یہ پروگرام پسند کیا گیا، اور آل انڈیا نے اس کو آرکائیوز میں رکھا۔ اس طرح غالبؔ پر دو ڈرامے، اور قومی پروگرام میں مثنوی میر حسنؔ پر پروگرام تیرہ زبانوں میں ترجمہ کر کے علاقائی اسٹیشنوں سے نشر کیا گیا۔ سرینگر سے پروگرام نوجوانوں کے لیے تجربے کے طور پر کمالؔ نے شروع کیا تو بے حد پسند کیا گیا۔ بالآخر روز صبح براڈ کاسٹ ہونے لگا۔ دلّی سے بھی نوجوانوں کا پروگرام بعد میں شروع ہوا۔ اور بالآخر یووانی چینل ہر اسٹیشن سے شروع ہوئی۔ کمالؔ ترقی پا کر، جب 1972ء میں ڈپٹی پروڈیوسر کی حیثیت سے ڈائرکٹوریٹ جنرل میں دلّی آئے، تو کچھ عرصے کے بعد سارے ملک کے اردو پروگراموں کے ساتھ ہر زبان کی یووانی سروس کی نگرانی کے فرائض ان کے سپرد ہوئے۔

جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اہمیت کے پیش نظر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے اسّی کے دہے کے شروع سے براڈ کاسٹنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس شروع کیا، اور مہمان استاد کی حیثیت سے کمالؔ کو سپرد کیا۔ 1985ء میں ریڈیو سے ریٹائر ہوئے تو اگلے روز پہلی جولائی سے جامعہ ملّیہ کے ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر میں فیلوشپ پر پڑھانے لگے۔ اردو میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تدریس کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ کمالؔ سے کہا گا وہ ایک مبسوط کتاب لکھ دیں۔ چنانچہ انھیں پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا گیا، اور 1990ء میں انھوں

نے مقالہ مکمل کر لیا اور جون 1998ء میں 646 صفحات کی کتاب ''اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل اور ابلاغ کی زبان'' فروغ اردو کونسل سے شائع ہوئی، جس میں ریڈیو لہروں کی ایجاد دریافت سے لے کر براڈ کاسٹنگ کی ترقی اور ہندوستان میں اس کی مکمل تاریخ ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

کمالؔ نے کشمیر میں غالبؔ اور اقبالؔ پر تحقیق کا کام شروع کیا تھا ان دونوں پر ان کے مضامین اور کتابوں کو مستند حوالے سمجھا جاتا ہے۔ بڑی تختی پر چار سوا ٹھاسی صفحے کی کتاب ''بیاض غالبؔ''، تحقیقی جائزہ، وہ کام ہے جس نے غالبؔ سے منسوب اس مخطوطے کو جعلی ثابت کیا، جس کو مقتدر غالبؔ شناسوں نے بخط غالبؔ تسلیم کیا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر فرمان فتحپوری (کراچی)، پروفیسر محمد حسن نے کمالؔ کی تحقیق سے اتفاق کیا۔ بی بی سی نے بھی ''کتاب خانہ'' کے عنوان سے اس پر ایک پروگرام بھی کیا۔

کشمیر میں تیس برس میں کمالؔ نے انگریزی اور فارسی میں فراہم ساری دستاویزات کی چھان پھٹک کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور پروفیسر محبّ الحسن سے بھی استفادہ کیا۔ کشمیر پر یوں تو انھوں نے نظم اور نثر میں بہت لکھا ہے۔ خاص طور سے للّہ عارف/للّہ یوگیشوری، شیخ نورالدین حبہ خاتون، رسل میرؔ، ظفر خانِ احسن، غنی کاشمیری وغیرہ پر۔ اہم کام کشمیر پر ان کی نظمیں ہیں اور شاید سب سے اہم کام ''کشمیر: ایک منظر نامہ'' ہے۔

کشمیر ہندوستان کے نقشے پر ایک تاج کی طرح ہے۔ اپنے محلِ وقوع اور سردیوں میں برف باری کی وجہ سے یہ علاقہ الگ تھلگ ہوتا تھا، لیکن ہمیشہ سے اسے دھرتی کا سورگ کہا جاتا تھا۔ لال قلعہ میں یہ شعر کندہ ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

یہ شعر ویری ناگ کی عمارت پر بھی، جو جھیلم کا ایک منبع ہے، کندہ ہے۔ جہانگیر کے زمانے سے گرمیوں میں مغل شہنشاہ گرمیاں کشمیر ہی میں گزارتے تھے۔ جہانگیر نے تو آخری سانس، کشمیر سے واپسی کے وقت جموں ہی کے ایک علاقے میں لی، اور اس کی انتڑیاں وہیں دفن ہیں۔ اور نور جہاں کو لاش کے ساتھ لاہور آتے وقت حراست میں لے لیا گیا تھا۔ سرینگر میں نشاط اور شالیمار مغل باغات ہیں۔ آدی شنکر آچاریہ کشمیر گئے تھے اور ان کے نام پر سرینگر میں ایک پہاڑی ہے۔ ہر عہد میں کشمیر کا گہرا تعلق برصغیر سے رہا ہے۔ کشمیر کی تحریک حریت میں اقبالؔ کے علاوہ اور بہت سی شخصیتوں نے اہم حصہ لیا ہے۔ عالموں نے بھی وہاں جا کر خدمات انجام دی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم ایک ایسی ہی شخصیت ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کے بھی کشمر کی قیادت سے گہرے مراسم تھے۔ ایلیس سے ان کا نکاح شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے پڑھوایا تھا۔ جب فیضؔ راولپنڈی سازش کیس میں سجاد ظہیرؔ کے ساتھ قید کیے گئے تو کمالؔ کشمیر ہی میں تھے، انھوں نے ایک طویل نظم احتجاجاً لکھی۔ سات برس ہوئے پروفیسر غلام محمد شادؔ کاشمیری نے کلام فیضؔ کا ایک انتخاب کیا، اور ان کا منظوم ترجمہ کیا، جو شعلہ آوازؔ کے نام سے شائع ہوا۔ فیضؔ کی 28 نظموں کے ساتھ کمالؔ کی طویل نظم کا ترجمہ شروع میں ہے، اور اس نظم میں اشعار کی تعداد فیضؔ کی نظموں کے اشعار کی کوئی ایک چوتھائی ہے۔ کمالؔ کشمیر میں خاموشی سے ثقافتی محاذ پر کام کرتے رہے، لیکن وہ آزادی سے اب تک

ترقی پسند مصنفین کے رکن رہے ہیں۔ اتر پردیش کی انجمن کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں، جنوادی لیکھک سنگھ کے نائب صدر رہے ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرپرستوں میں ہیں۔ یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کشمیر کی سیاست کے ایک نہایت اہم موڑ پر سیاسی مینی فیسٹو بھی لکھے ہیں، اور اہم سیاسی بیانات بھی۔ عام لوگ اور یونیورسٹیوں کے استاذہ انھیں ریڈیو، ٹی وی پروگراموں کے علاوہ ان کے لکچروں کی وجہ سے بھی جانتے ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ پر ان کا اہم کام ہے۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی کتاب ''آتشِ چنار'' شائع ہوئی تو عصری ادب نے ان سے تفصیلی تبصرہ کرنے کی فرمائش کی، اس سے پہلے عصری ادب میں سیّد میر قاسمؔ کی کتاب ''داستانِ حیات'' پر ان کا تبصرہ چھپ چکا تھا۔ کمال احمد صدیقی نے شیخ صاحب کی کتاب پر اتنا تفصیلی تبصرہ لکھا کہ وہ خود ایک چھوٹی کتاب سی ہوگئی۔ عصری ادب نے اس تبصرے میں ایک اور جہت پیدا کر دی۔ اسے کمال احمد صدیقی کے خط میں چھاپ دیا۔ اس تبصرے کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرورؔ نے علی گڑھ سے اور قیصر تمکینؔ نے لندن سے خط لکھے جو عصری ادب میں چھپے۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور پروفیسر محبّ الحسن کشمیر میں رہ چکے تھے، اور کمالؔ سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ پروفیسر محبّ الحسن نے کمالؔ کو منظر نامہ کے بارے میں اپنا تأثر لکھا۔ یہ ایک تاریخ داں کا نقطۂ نظر ہے۔

''قریب تین برس ہوئے کہ میری کتاب BABUR: FOUNDER OF THE MUGHAL EMPIRE IN INDIA نکلی تھی، اور اب ان میں ''ڈوگرا عہد کا کشمیر'' پر کام کر رہا ہوں، اور امید ہے کہ اس سال کے آخر تک کتاب مکمل ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں میں

نے آپ کا مضمون، شیخ عبداللہ کی آتشِ چنار (کشمیر: ایک منظرنامہ: عصری ادب) پڑھا۔ مجھے اس کو پڑھ کر خوشی ہوئی۔ میرے بھی خیالات اس کتاب، اور شیخ عبداللہ کے متعلق وہ ہی ہیں جو آپ کے ہیں۔ آپ کو کشمیر کی سیاست پر کافی معلومات ہیں۔ آپ سے میں ملنا چاہتا ہوں۔''

محبّ الحسن

7.5.1993

کمال احمد صدیقی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ ان کا ایک دیوان کشمیر پر ہے۔ اس دیباچہ کو ان کی ایک نظم کے چار شعروں پر ختم کرتا ہوں:

ہر ایک ذرّے پہ مقتول شیرخوار کا نام
ہر ایک پتّی پہ اک قاتلِ بہار کا نام
کہیں بھی آج وہ بادام کے درخت نہیں
کھُدا تھا جن پر ہزاروں ہی دلفگار کا نام
چنار کٹ گئے، اب ڈھونڈنے سے ملتے ہیں
شناخت تھا مرے کشمیر کی، چنا کا نام
ہمیں تھے کام بہت رو سکے نہ جی بھر کے
ہمارے نام پہ رکھ دو اس آبشار کا نام

مشیر الحسن

محمد یوسف ٹینگ کو اس بات پر اصرار ہے کہ شیخ محمد عبداللہ آتش چنار کے ایک ایک لفظ کے مصنّف ہیں، کیونکہ وہ بولتے تھے، اور ٹینگ لکھ لیتے تھے۔ مسوّدہ صاف کر کے شیخ صاحب کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ اگر وہ اس میں کچھ کمی بیشی پاتے، تو انہیں ناگوار گزرتا، اور کبھی کبھی تو مشتعل بھی ہو جاتے۔ مسوّدے کی تصحیح کرتے، اور اس طرح کتاب تیار ہوئی۔ کتاب کی زبان پر ایک نظر آل احمد سرور نے بھی ڈالی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے اسلوب میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ اور یہ اچھا ہی کیا۔ اس طرح کشمیر کی اردو کا جو علاقائی رنگ ہے وہ اس کتاب میں سلامت ہے۔ شعروں میں 'مرے' کی جگہ 'میرے' اور 'ترے' کی 'تیرے' بھی انہوں نے رہنے دیا۔ اور بھی ایسی باتیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک اہم سوانح حیات میں یہ پہلو جس کا تعلق سراسر کتابت سے ہے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ''آتشِ چنار'' وادیٔ کشمیر میں بولی جانے والی اظہارِ خیال اور بیان کی عام زبان کے مستند اور معتبر نمونے کی حیثیت سے بھی ایک اہم لسانیاتی اور تاریخی دستاویز ہے۔ اہلِ کشمیر کی مادری اور تہذیبی زبان کشمیری ہے لیکن اردو سے بھی ان کا ثقافتی رشتہ بہت گہرا ہے، اردو کو وہ اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ کو۔ اقبالؔ اور کلام اقبالؔ نے کشمیر کی جمہوری تحریک میں، اور کشمیر کی سیاسی بیداری میں ایک بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

''غبارِ خاطر'' میں کئی جگہ احساس ہوتا ہے کہ ابوالکلام آزاد نے تزئینِ عبارت کے لیے شعر ٹانکے ہیں۔ یا شعروں نے مضمون سُجھایا ہے۔ یا بات موضوع کے دائرے سے نکل گئی ہے۔ اور ایسے موقع پر شعر نے سانس لینے اور موضوع پر واپس آنے میں مدد دی ہے۔ حالانکہ ابوالکلام نے ایک مشّاق ادیب کی طرح شعر عبارت میں اس طرح بُنے ہیں کہ وہ اسلوب کی وضع کا حصّہ ہوگئے ہیں۔ جو لوگ شیخ محمد عبداللہ یا آزادی سے پہلے کے کشمیر کے رہنماؤں کے طریق سے واقف نہیں ہیں، شاید کچھ اس طرح کا احساس انہیں ''آتشِ چنار'' میں بھی شعروں کی بہتات دیکھ کر ہو۔ میں چونکہ تین دہوں سے کچھ زیادہ کشمیر میں رہا ہوں اور اس زمانے میں بھی جب رہنماؤں اور عوام کے درمیان، مقرّر اور سامعین کے درمیان، انتخاب میں امیدوار اور ووٹر کا کسی حد تک لاتعلقی کا، یعنی باہمی اور غیر ذاتی رشتہ نہیں بلکہ ذاتی، نجی اور براہِ راست رابطہ تھا۔ مقرّر بھی مجمع میں عام طور سے سب کو نہیں تو قریب قریب سب کو ان کے ناموں سے جانتے تھے دستور ساز اسمبلی میرے سامنے قائم ہوئی اور جب اس کے لیے وادی کے سارے امیدوار ''بلا مقابلہ'' منتخب ہوئے تو ان انتخابات کے وقت بھی میں وہاں تھا۔ انتخابی جلسوں کی ضرورت حلقۂ انتخاب میں صرف نیشنل کانفرنس کا واحد امیدوار ہونے کی وجہ سے عام طور سے پیش نہیں آئی۔ کسی حلقے سے ڈمی امیدوار بھی کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ بعد میں وہ اپنا نام واپس لے لیتا۔ صرف امیرا کدل کا ایک حلقہ تھا، جہاں خواجہ غلام محمد صادق کے مقابل کشمیری پنڈتوں کے نمائندے کی حیثیت سے شیونرائن فوتیدار کھڑے ہوئے تھے۔ ایک جلسے میں انہیں وہ رول یاد دلایا گیا جو مفادِ خصوصی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہوں نے عوامی تحریک کے خلاف اور مہاراجہ کے شخصی راج کے حق میں ادا کیا تھا۔ ہوا کا رخ دیکھ کر انہوں نے امیدوار کی حیثیت سے اپنا نام واپس لے لیا۔ اور نیشنل کانفرنس کی ممبری کا فارم بھر کر اپنا مستقبل

سنوار لیا۔ نیشنل کانفرنس نے انہیں پارلیمنٹ کا ممبر بنوا دیا۔ اور بعد میں جب قانون ساز کونسل وجود میں آئی، تو وہ اس کے چیئرمین ہوئے۔ ''آتش چنار'' اپنے عہد کی تاریخ لکھنے کی ایک کوشش بھی ہے اور تاریخ کے ناقد کی حیثیت سے اسے چھان پھٹک کے بعد استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

شیخ صاحب نے دستور ساز اسمبلی کے سلسلے میں جو منتخب واقعات بیان کیے ہیں، وہ تصویر کا ایک رخ پیش کرتے ہیں۔ اب ہم پھر ''آتشِ چنار'' میں جا بجا برمحل اشعار کی طرف واپس آتے ہیں کہ یہ اس کے اسلوب کا ایک پہلو ہے۔ ابتدائی دور میں کشمیر کے دو آتش نوا مقرر، شیخ عبداللہ (شیرِ کشمیر) اور غلام محی الدین قرہ (بلبلِ کشمیر) تھے۔ یہ دونوں اپنی تقریروں میں شعروں کا خاص طور سے اقبالؔ کے شعروں کا استعمال کرتے تھے۔ شیخ صاحب تو، مجمع اگر مسلمانوں کی اکثریت کا ہو، تو قرآن کی کوئی آیت خوش الحانی سے پیش کر کے اپنی تقریر کا آغاز اس کے ترجمے سے کرتے تھے۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کے سامعین اور ان کے عقیدت مندوں کو توڑنے کے لیے یہ ایک مؤثر حربہ تھا۔ بعد میں شعروں سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ محی الدین قرہ اقبالؔ ہی کے کسی شعر سے تقریر شروع کرتے تھے۔ ایک بار ایسا بھی ہوا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ انہوں نے پہلا مصرع ختم کیا تو معلوم ہوا کہ مائیکروفون یا اسپیکر آدھے مصرع سے پہلے ہی بیٹھ گیا تھا۔ سسٹم بار بار خراب ہوتا رہا اور وہ بار بار اسی شعر سے آغاز کلام کرتے رہے۔ امیرا کدل کے جلسے میں جب بلبلِ کشمیر نے چوتھی بار شعر پڑھا تو وہ سامعین تک پہنچا۔ اچھے مقرر سیّد میر قاسم، مرزا افضل بیگ، مولوی سعید مسعودی، بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق بھی تھے۔ ان سب کو شعر سے ذوق تھا، لیکن یہ اپنی تقریروں میں شعر نہیں ٹانکتے تھے۔ بیگ صاحب بس سامعین

کومی لارڈ نہیں کہتے تھے۔ ان کی تقریریں بظاہر جذباتی لیکن اصل میں دلائل پر مبنی ہوتی تھیں۔ خواجہ غلام محمد صادق فکر و دانش کو عوام کی ذہنی سطح تک لانے کی جدو جہد کرتے تھے ۔مولوی سعید مسعودی عوام کے مزاج شناس تھے، اور ایک ہی نکتہ کو مرکز بناتے تھے۔

سیّد میر قاسم اپنے نقطۂ نظر کی وکالت گرم لہجے میں کرتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علم کی حیثیت سے سیاست میں آئے اور ایسے زور و شور سے کہ مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خاں کا الیکشن لڑانے کے سلسلے میں انہیں اہم ذمہ داری دی گئی تھی۔ ایک طرح سے وہ باقاعدہ تربیت یافتہ خطیب ہیں۔ بخشی غلام محمد کا یہ اصول تھا کہ کوئی بات پوری نہیں کرتے تھے۔ جو بات سامعین جانتے تھے وہی ان کو انہیں کی زبان میں بتا دیتے تھے۔ سننے والوں کی انا کی تسکین ہوتی تھی کہ ان کی معلومات لیڈر سے کم نہیں۔ عادتیں اچھی ہوں یا بری دیر سے چھوٹتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی چھوٹ جانے کے باوجود خود کو ظاہر کر جاتی ہیں۔ انہیں میں شعر خوانی کا عادت بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خیال کے اظہار کے لئے یا خیال کو زیادہ دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے شعر کو محور شیخ محمد عبداللہ ہی نے بنایا ہوگا، کیونکہ یہ ان کی تقریر کا اسلوب تھا۔ یہ خود نوشت ان کی تحریر نہیں بلکہ ان کی تقریر کی تحریری شکل ہے۔ اس بات سے حیرت تو نہیں، خوشی ضرور ہوئی کہ شیخ صاحب نے جلال الدین رومی، امیر خسرو، میر تقی میر، انشاء، غالب، اقبال اور فیض وغیرہ کے شعروں کے ساتھ میرے شعر کو بھی لائق تقریر سمجھا۔

شیخ محمد عبداللہ کشمیر میں اپنے عہد کی سب سے زیادہ قد آور شخصیت ہیں، ان کی وجہ سے نہ صرف کشمیر میں بلکہ برصغیر میں اُتھل پتھل ہوئی۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار، اور یہ سلسلہ

استمراری سا ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ اقتدار میں نہیں ہوئے تو ان کی شخصیت دیو مالائی، اور ایک مشتق وضع کرنے کی اجازت ہو تو کرشمائی رہی۔ اقتدار میں انہیں نامقبول اقدامات بھی کرنا پڑے اور اقتدار کے حصول کے لئے بھی انہیں ایسا کرنا پڑا۔ اقتدار نے اپنی قیمت کے طور پر ان کی شخصیت کا ایک حصہ لے لیا۔ میں نے شیخ صاحب کو اقتدار کے زمانے میں بھی جب وہ اقتدار میں نہیں تھے، بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پبلک جلسوں میں بھی، اور اکیلے بیٹھک میں بھی۔ جو جُل انہیں رفیقوں سے ملے اور عوام سے ملے اور جو جُل انھوں نے رفیقوں اور عوام کو دیئے، ان کی وجہ سے ایک عجیب سی تلخی ان کے ذہن میں سرایت کر گئی۔ ان کے دل پر ناخوشگوار واقعات نقش ہو جاتے تھے۔ اور وہ حقیقت پسندی سے دور ہو جاتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہو جاتا، ان لوگوں کا رول ماضی میں بھی ان کو بے حقیقت نظر آنے لگتا، حالانکہ وہ ان کے دستِ راست رہ چکے ہوتے، اور خود اپنی زبان سے وہ ان کی تعریف و توصیف کر چکے ہوتے۔

''آتشِ چنا'' پڑھنے سے پہلے خیال تھا کہ انھوں نے سیاسی شخصیتوں سے بہت سے حساب چکائے ہوں گے۔ لیکن کتاب پڑھ کر احساس ہوا کہ ایک آدھ جگہ چھوڑ کر ان کا روّیہ بہت زیادہ غیر معروضی نہیں ہے، یہاں تک کہ انھوں نے ایک ایسی بات کا بھی ذکر کر دیا ہے جس سے اپریل 1964ء میں، سازش کا مقدمہ اٹھالئے جانے کے بعد انھوں نے قطعی لاعلمی ظاہر کی تھی۔

ہفتہ وار ''آئینہ'' (سری نگر) کے ایڈیٹر شمیم احمد شمیم اس وقت ایم۔ ایل۔ اے بھی نہیں تھے، پارلیمنٹ کے ممبر بعد میں ہوئے۔ رات کے کھانے پر انھوں نے شیخ محمد عبداللہ،

مرزا افضل بیگ، پریم ناتھ بزاز، جانکی ناتھ زتشی، پیٹریٹ کے نمائندے اور اپنے برادرِ نسبتی محمد سعید ملک، محمد یوسف ٹینگ کو اور مجھے بلایا تھا۔ زتشی اور بزاز ان دونوں مہمانانِ خصوصی کے آنے سے پہلے ہی رخصت ہوگئے۔ کھانے کے بعد شیخ صاحب نے 1930ء سے لے کر اُس وقت تک کے کشمری کے حالات کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہ کشمیر کے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے موقف کے مبلغ تھے اور مرزا افضل بیگ محاذِ رائے شماری کے صدر تھے۔ شیخ صاحب کی رہائی کے فوراً بعد نیشنل کانفرنس کے سارے دفتروں پر سے، سرینگر کو چھوڑ کر ـــــ حکمراں جماعت کے جھنڈے اتر گئے تھے۔ اور محاذِ رائے شماری کے دفتر وہیں بن گئے تھے۔ وہ جھنڈے ان پر لہرانے لگے تھے جن میں دو ہاتھ مصافحہ کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ شیخ صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ کشمیر کے لئے بہترین حل یہی ہے کہ وہ آزاد اور خودمختار ریاست ہو، اور ہندوستان اور پاکستان دونوں اس کی خود مختاری کی ضمانت دیں۔ اور چین بھی یہ تسلیم کرے۔

میں نے کہا ''شیخ صاحب یہ بات تو جواہر لال نہرو بھی جانتے تھے، تقسیم کے وقت ریاست کا ہندوستان کے ساتھ مواصلاتی نظام اور رسل ورسائل کا انتظام نہیں تھا۔ سرینگر اور دوسرے قصبوں کے ڈاک خانوں اور تار گھروں کا بندوبست مہاراجہ نے پاکستانی سرکار کے حوالے کر دیا تھا۔ صادق صاحب، بخشی صاحب، مرزا افضل بیگ، مولوی سعید مسعودی، سب پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھے۔ صادق صاحب نے اس سلسلے میں آپ کے نمائندے کی حیثیت سے پاکستان کے زعما سے بات بھی کی تھی۔ جواہر لال نہرو کو ان سب باتوں کی اطلاع تھی۔ سردار پٹیل نیا کشمیر پروگرام کو کمیونسٹ مینی فیسٹو سمجھتے تھے۔ وہ کشمیر کو ہندوستان کی آئندہ پریشانیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ صرف آپ ہندوستان سے الحاق چاہتے تھے، حالانکہ جواہر لال نہرو بھی یہی چاہتے تھے کہ کشمیر ایشیا کا سوئٹزرلینڈ

بنے۔ آپ نے لال چوک میں جواہر لال کا استقبال کرتے ہوئے اعلان کیا:

من تو شدم، تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ تو آپ جانیں کہ جواہر لال اور آپ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن جب ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے آپ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرنے لیک سکسس جا رہے تھے تو دلّی سے جہاز ٹیک آف کرنے کے تھوڑی دیر بعد، وفد کے لیڈر گوپال سوامی آئینگر نے آپ کو ایک کاغذ دیا تھا''۔

شیخ صاحب نے کہا کہ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی''۔ میں نے کہا ''آپ نے اس کاغذ کر پڑھنے کے بعد جانکی ناتھ زتشی کو دے دیا تھا''۔

اب شیخ صاحب مشتعل ہوگئے، لیکن خود پر جبر کر کے غصّہ پر قابو پایا۔ میں نے پھر کہا ''اس کاغذ میں لکھا تھا کہ کشمیر کا ایک آزاد ریاست کے طور پر رہنا بھی ایک حل ہوسکتا ہے، اگر ہندوستان اور پاکستان دونوں اس کی آزادی کا احترام کرنے کی ضمانت دیں''۔

شیخ صاحب نے مرزا افضل بیگ سے کہا ''بیگ صاحب اس کاغذ کے ٹکڑے کی کیا اہمیت تھی۔ اس پر کسی کے دستخط تو تھے نہیں''۔

بیگ صاحب کو جماہی آئی اور انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا شیخ صاحب گوپال سوامی آئینگر مرکزی کابینہ میں وزیر بے محکمہ تھے۔ کشمیر کے معاملات وہی جواہر لال کے لئے دیکھتے تھے۔ آپ کشمیر کے وزیراعظم تھے اور اس بات کی اہمیت سے واقف ہیں کہ کابینہ کی سطح کا وزیر کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کرسکتا جو کابینہ، کم ازکم وزیراعظم کا منشا نہ ہو۔ ایڈ میموآئر پر دستخط نہیں ہوتے۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کیونکہ جس طرح مرکز میں جواہر لال نے وزیراعظم ہونے کے ساتھ وزارتِ خارجہ کا قلمدان اپنے پاس رکھا تھا، آپ

نے بھی وزارتِ خارجہ کا قلمدان ریاست میں اپنے پاس رکھا''۔

شیخ صاحب نے جواب نہیں دیا، گھڑی دیکھی، دو بج چکے تھے، اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''آتشِ چنار'' میں گوپال سوامی آئینگر کا یہ ''کاغذ'' ہوائی جہاز میں دنیا بیان کیا گیا ہے لیکن اس طرح!

''نیویارک سے واپسی پر میں اقوام متحدہ کے بارے میں جو تأثرات لے کر آیا تھا شاید اسی نوعیت کے تأثرات گوپال سوامی آئینگر کے دل میں اُبھرے تھے۔ جب ہم نیویارک سے ہند کے لئے ہوائی جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ تو آئینگر صاحب نے جو میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے، ایک کاغذ میرے حوالے کیا اور کہا کہ اسے پڑھ لو۔ اس میں انھوں نے کشمیر کے مستقبل کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کشمیر کو آزاد رکھنا ہی اس گتھی کا بہترین حل ہوسکتا ہے کیونکہ ریاست کی سرحدیں اتنی لمبی چوڑی ہیں اور کتنے ہی بڑے ملکوں سے ملتی ہیں۔ اس لئے ان سرحدوں کی حفاظت کا دردِ سر اور بوجھ ہندوستان برداشت نہیں کرسکتا''۔

اس کاغذ کے دیئے جانے کا وقت دلّی سے روانگی کے بعد نہیں دلّی واپس آتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے شیخ صاحب کی یادداشت نے، لکھاتے وقت ساتھ نہ دیا ہو اور انھوں نے مسوّدہ پڑھتے وقت بھی شاید اس پر غور نہیں کیا، کہ اتنی اہم بات، اگر اقوام متحدہ کے اجلاس سے واپسی کے بعد مرکزی وزیر کو بتانا بھی ہوتی، تو وہ دلّی واپسی کے بعد وزیراعظم سے گفتگو کئے بغیر نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی لکھ کر کیونکہ ہوائی جہاز پر آئینگر شیخ صاحب کے برابر کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ نہ وہ سکریٹری کو ڈکٹیشن دے سکتے تھے اور نہ ٹائپ

کرا سکتے تھے۔ اپنے قلم سے لکھ کر ایسی دستاویز دیتے!

یہ ایک پیراگراف ساڑھے سات سطروں کا ہے لیکن اس میں کشمیر کی تاریخ کا ایک بہت اہم پہلو، ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ جواہر لال نہرو کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر برصغیر میں برطانوی سامراج کا خاتمہ، تقسیم اور خون خرابے کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید جواہر لال کشمیر کے لئے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا تصور بھی نہ کرتے۔

خواجہ غلام محمد صادق سے روزانہ ملاقات ایک معمول تھا، ان کے ساتھ کبھی کبھی ڈاکٹر سیّد نصیر احمد شاہ بھی درگجن اسپتال مجھے دیکھنے آتے تھے۔ جب صادق صاحب دستور ساز اسمبلی کے صدر ہوئے تو ان کی مصروفیتیں بڑھ گئیں۔ ہفتہ میں ایک روز ان کی گاڑی لینے آتی اور شیر گڑھی میں ان کے دفتر میں دن کے کھانے سے، شام کو دفتر سے اُٹھنے تک ملاقات رہتی۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں جب شیخ صاحب دوبارہ درگا پرشاد دھر کو ساتھ لے کر اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرنے گئے تھے (یہ 1952ء کے شروع کی بات ہے) تو صادق صاحب نے دلّی، بمبئی سے واپس آکر کچھ باتیں بتائیں، جو میاں افتخار الدین سے ہوائی اڈے کی ملاقات میں ہوئی تھیں میاں افتخار الدین شیخ صاحب کے لئے ایک پیغام بھی چھوڑ گئے تھے۔ صادق صاحب نے شیخ کے لیک سیکسس کے (پچھلے) دورے کے وقت جہاز میں آئینگر کے شیخ صاحب کو ایک یادداشت دینے کی بات کا ذکر کیا تھا۔ صادق صاحب کو اس یادداشت کے بارے میں خود آئینگر نے بتایا تھا۔

ہے تو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ، لیکن شیخ صاحب نے اسے ''آتشِ چنار'' میں شامل کر کے ایک اہم کام کیا ہے۔ وقت کے سلسلے میں ان کی بیان درست نہیں ہے، اس کے

باوجود اس واقعہ کا لکھا جانا اہم ہے۔ نہرو کے بعد کوئی مرکزی سرکار عوام کو یہ بتانے کی جرأت نہیں کرسکتی کہ جواہر لال نہرو یہ چاہتے تھے کہ کشمیر ایک آزاد اور خودمختار مملکت ہو۔ جواہر لال، غلام محمد صادق اور سیّد میر قاسم چاہتے تھے کہ ماضی کی غلطیوں اور تلخیوں کو فراموش کرکے یا ان سے سبق لے کر کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہوجائے، اسی لئے گفت وشنید کے لئے شیخ صاحب کو صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوّب خاں سے ملنے بھیجا گیا تھا۔ جواہر لال پوری طرح صحت مند نہیں تھے۔ ایک ایسے مرحلے پر ''معیّن دن'' آیا اور پھر کشمیر کے سلسلے میں سرکار کی پالیسی یکسر بدل گئی کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یم دوت نے بساطِ سیاست پر بھی ایک چال چلی۔ یم دوت کو اس ملک کی سیاست سے خاصی دلچسپی ہے بلکہ برصغیر کی سیات میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

''آتشِ چنار'' میں واقعات کی کمی نہیں، لیکن ایک عام قاری کے لئے یہ مشکل ہوگی کہ اس پر کشمیر کی جمہوری تحریک کے خدّ وخال تو واضح ہوجائیں گے لیکن سنہ کے سلسلے میں کئی مقامات اندھیرے میں رہیں گے۔ متن میں سنہ نہیں تھے تو حواشی میں دیئے جاسکتے ہیں یہ کام دوسرے ایڈیشن یا دوسری جلد میں بھی کیا جاسکتا ہے، اس وقت کچھ لوگ موجود ہیں جو زمانے کا تعین کرسکتے ہیں۔ بعد میں یہ کام مشکل ہوجائے گا۔

عام طور سے واقعات معتبر ہیں اور یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ شیخ صاحب نے بڑی حد تک حقیقت پسندی سے کام لیا ہے، اگرچہ اس کی وجہ سے ان کے موقف میں تبدیلی بھی کھل کر سامنے آئی ہے۔ ص 359 اور 360 پر:

''میں نے پہلی تقریر 15 رمئی 1946ء کو مائسیمہ میں دھن جی بھائی اڈے

کے احاطے میں کی اور اعلان کیا کہ انگریزوں کے جانے کے ساتھ ہی وہ تمام راجے مہاراجے بھی چلے گئے ہیں جو انگریز سامراج کے پٹھوؤں کی حیثیت سے اپنی رعایا پر مسلّط تھے۔ اور وہ سارے معاہدے بھی کالعدم ہوگئے ہیں، جو ناجائز طریقے سے عمل میں لائے گئے تھے، اور جن کا منشا عوام کو ان کی مرضی کے خلاف طوقِ غلامی پہنانا تھا۔ میں نے ایک اور تقریر زینداز محلّہ میں کی اور کہا کہ ہم ایک ایک روپیہ اکٹھا کرلیں گے اور اس طرح سے پچھتر لاکھ روپے کی وہ رقم مہاراجہ کو واپس کریں گے جس کے عوض اس کے پردادا مہاراجا گلاب سنگھ نے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے کشمیر کو خرید لیا تھا، اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

اے باد صبا گر بہ جنیوا گذر کنی [1]
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے
دہقان وکشت وجوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

میں نے ایک اور تقریر اندرون شہر میں کی۔ میری تقریریں اس قدر جوشیلی تھیں کہ سارے کشمیر میں عزم اور ولولے کا ایک الاؤ روشن ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ علامہ اقبالؔ نے اپنے شاعرانہ مکاشفے میں کشمیر کی حالت کے بارے میں جو بشارت دی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہوگئی ہے ؎

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور
ملّتے برخیزد از خاکِ قبور''

---

1. اقبال کا مصرعہ ہے: باد صبا اگر بہ جنیوا سنی

شیخ صاحب نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک چلائی اور اسی کی پاداش میں انھیں مرزا محمد افضل بیگ اور کشپ بندھو کو قید کر دیا گیا۔ تین سال قید کی سزا تھی، لیکن 29 ستمبر 1947ء کو صرف ایک سال چار مہینے اور گیارہ دن بعد ہی رہا کر دیا گیا۔ اس درمیان میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور آصف علی نے شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے لئے جو کوششیں کیں ان کا کچھ ذکر ہے۔ بھدرواہ جیل کے کچھ دلچسپ واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے، پاکستان کے ساتھ معاہدہ کرنے میں مہاراجہ ہری سنگھ اور ان کے وزیر اعظم رام چندر کاک کو ناکامی ہو چکی ہے۔ ص 386 اور 387 سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

''11 اگست 1947ء کو مہاراجہ کے ستّرے بہتّرے ماموں جنرل جنک سنگھ نے قائم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے چارج سنبھالا، ادھر قبائلیوں کی نقل و حرکت کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ ان خبروں سے مہاراجا اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے، ہندو مہاراجا ہراساں ہو کر اپنی نجات میری رہائی میں ہی سمجھنے لگا۔ اس کو اب نوشتۂ دیوار نظر آ رہا تھا کہ میں ہی آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا کام کر سکتا ہوں۔ مہاراجہ پر اندرونی دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ اور باہر سے بھی کانگریس کی کوششوں میں تیزی اور شدت آتی گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی مہاراجہ کو یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ہی ریاست کو بچا سکتا ہے۔ بالآخر مہاراجہ نے مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھدرواہ سے بادامی باغ ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں مہاراجہ کا برادرِ نسبتی کنور سچیت چند مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد طے ہوا کہ مہاراجہ کی اور میری ملاقات

ہو۔ مجھے شاہی محل پہنچا دیا گیا۔ وہاں جانے سے پہلے مجھے مشورہ دیا گیا کہ ملاقات کے وقت میں خیر سگالی کے طور پر کچھ اشرفیاں مہاراجہ کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے جب یہ کہا کہ اشرفیاں تو میرے پاس نہیں ہیں تو پنڈت شام سندر لال در نے اپنی جیب سے کچھ اشرفیاں نکال کر میرے حوالے کیں۔ میں جب مہاراجہ کے پاس پہنچا تو وہاں مہاراجہ، اس کی رانی اور ہونے والے وزیر اعظم مہر چند مہاجن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اشرفیاں مہاراجہ کو پیش کیں۔ میں نے مہاراجہ سے کہا کہ آپ کو جو غرض مند لوگ ان شبہات میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست کے مسلمان آپ کے یا آپ کے خاندان کے دشمن ہیں، وہ غلط فہمی اور بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی آپ کی گدّی چھیننا نہیں چاہتا۔ البتہ ہم ریاست کا نظام حکومت ایک آئینی اور جمہوری طریقے سے چلانا چاہتے ہیں''۔

شیخ صاحب کی تقریروں اور مہاراجہ سے ان کی ملاقات کی روداد میں ایک واضح تضاد ہے۔ دونوں رُخ اپنی ہی سوانح حیات میں پیش کرنا بڑی اخلاقی جرأت کا کام ہے۔ ایک بات البتہ شیخ صاحب نے اس سلسلے میں نہیں لکھی ہے، جس کا لکھنا ضروری تھا۔ جو بات انھوں نے مہاراجہ ہری سنگھ سے اشرفیوں کا نذرانہ دینے کے بعد کہی، وہی ان کے اس دستخطی بیان میں بھی تھی، جو عدالت کو پیش کیا گیا تھا۔ یعنی کشمیر چھوڑ دو تحریک کا مقصد مہاراجہ کو موروثی حکمرانی سے محروم کرنا نہیں، بلکہ مہاراجہ کی سرپرستی میں جمہوری طریقے سے حکومت تشکیل دینا ہے، اس بیان سے بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ سیّد میر قاسم نے کسی قدر تفصیل سے اس موضوع پر ''داستانِ حیات'' میں لکھا ہے۔

رہائی کے بعد چھتہ بل ویر سے روایتی انداز میں شیخ صاحب کا آبی پرندے پر جلوس نکالا گیا۔ باقاعدہ استقبال ہوا اور 3/اکتوبر 1947ء کو حضوری باغ میں خطبۂ استقبالیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا (ص388):

''مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا تھا؛ اور کیوں رہا کیا گیا۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنے عوام سے دور رہا ہوں۔ اور تیزی سے بدلے ہوئے حالات سے الگ تھلگ۔ جس وقت میں جیل گیا اس وقت برصغیر ایک وحدت تھا۔ آج یہ دو ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ کشمیری عوام کو دیکھنا ہے کہ انھوں نے جس خواب کے لئے قربانیاں دی ہیں، وہ کس طرح پورا ہوسکتا ہے، ہم وہی راستہ اختیار کریں گے، جو کشمیریوں کی آزادی، خوشحالی، نجات اور ترقی کی منزل کی طرف جائے گا۔ غلامی کی صورت میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت فوراً قائم کی جانی چاہئے جو اس نازک سوال پر ریاستی عوام کے حقوق ومفادات کی نگہبانی کے لئے مناسب راہِ عمل اختیار کرلے۔ ہم الحاق کا فیصلہ اندرونی آزادی حاصل کیے بغیر نہیں کرسکتے۔ اس لئے ہمارا نعرہ یہ ہے کہ ''الحاق سے پہلے آزادی'' ایک اور پبلک جلسے میں انہیں دنوں میں نے اس سلسلہ میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے:

''اس وقت ریاست جموں وکشمیر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے ساتھ یا الگ تھلگ رہ کر آزاد رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس کا صدر ہوں، جس کی پالیسی بالکل واضح ہے۔ پنڈت جواہر لال میرے بہت قریبی دوست ہیں اور گاندھی جی

کی میں عزّت کرتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ہماری تحریک کی بڑی مدد کی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود الحاق کے مسئلے کی سب سے بڑی کسوٹی یہاں کے عوام کے مفادات ہوں گے اور میں اس میں حائل نہ ہوں گا۔ ہمارا سب سے پہلا فریضہ اس وقت ڈوگرہ تسلّط سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر یہاں کے لوگ پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کریں تو میں سب سے پہلا آدمی ہوں گا جو اس کو تسلیم کرے گا۔

لیکن میں نے ساتھ ہی اپنے بنیادی عقائد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا:

''اگر ہم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر بھی لیا تو اس دوقومی نظریے پر ہم کبھی بھی ایمان نہ لا پائیں گے جو آج سارے ملک میں اس درجہ زہر پھیلانے کا ذمہ دار ہے.....''

شیخ صاحب کو یقیناً معلوم تھا کہ انھیں کیوں گرفتار کیا گیا تھا، اور وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انھیں کیوں چھوڑا گیا تھا؟ انھوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کا حکمرانی کا موروثی حق تسلیم کرلیا تھا۔ شیخ صاحب نے یہ بحث بھی نہیں کی کہ ایسا انھوں نے اصول میں ترمیم کرکے کیا یا حکمت عملی کے تحت کیا۔ یا پھر اس وکیل کے مشورے سے کیا، جسے جواہر لال نہرو سے ہدایات ملتی تھیں۔ سیّد میر قاسم کی ''داستانِ حیات'' اس معاملے پر روشنی ڈالتی ہے۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی، وہاں دوقومی نظریہ سرکاری اور رسمی طور پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کے اس اعلان سے ختم ہوگیا کہ پاکستان میں ہر شہری کے حقوق، مذہب کے لحاظ کے بغیر برابر ہیں، اور قانون کی نظروں میں ہر پاکستانی شہری برابر ہے، یہ اعلان محمد علی جناح نے گورنر جنرل، یعنی صدرِ مملکت کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس اعلان کے بعد دوقومی

نظریے کی حمایت یا مخالفت دونوں بے معنی ہو گئے۔

26/اکتوبر کو ریاستوں کی مرکزی وزارت کے سکریٹری وی۔ پی مینن، دستاویزِ الحاق پر مہاراجہ کے دستخط کرا کے، ہوائی جہاز سے دلّی واپس آئے۔ ان کا استقبال کرنے دلّی کے ہوائی اڈے پر خود نائب وزیر اعظم سردار ولبھ بھائی پٹیل گئے۔ ص 418 پر شیخ صاحب نے اظہار کیا ہے:

''مہاراجہ کی حالت ایسی غیر تھی کہ اس نے 26/اکتوبر کو جموں پہنچنے پر اپنے خاص مصاحبین کو ہدایت دی تھی کہ اس کو اس کے خوابِ استراحت سے صرف اسی صورت میں جگایا جائے جب وی۔ پی مینن واپس آئے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ ہند نے الحاق منظور کر لیا ہے۔ دوسری صورت میں اس کو نیند ہی کی حالت میں اپنے پستول سے کنپٹی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ حکومت ہند نے اس مرحلے پر ریاستوں کے محکمے کے سکریٹری وی۔ پی مینن کو روانہ کیا۔ ان کی جیب میں دستاویزِ الحاق کا مسودہ تھا۔ وہ 26/اکتوبر کو ہی اس پر مہاراجہ کے دستخط کروا کے واپس دہلی پہنچ گئے۔ ان کا استقبال کرنے کو خود سردار پٹیل ہوائی اڈے پر گئے تھے اور انھیں اپنے ساتھ جواہر لال کی کوٹھی پر لے آئے۔ میں وہیں رک گیا۔ ان دنوں پنڈت جواہر لال یارک روڈ کی کوٹھی نمبر 1 میں رہائش پذیر تھے اور میں ان کے مہمان کی حیثیت سے وہیں مقیم تھا۔ وی پی مینن اور مہر چند مہاجن پنڈت جی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے اپنے الفاظ میں انھوں نے پنڈت جی سے کہا:

''فوج دیجئے الحاق کیجئے اور جو بھی اختیارات چاہئے عوامی پارٹی (نیشنل کانفرنس) کو دیجئے۔ لیکن آج ہی ہوائی جہاز سے فوج سرینگر بھیج دیجئے۔ ورنہ

میں جناح صاحب کے پاس جا کر مصالحت کروں گا''۔

''بھلا جواہر لال ایسی باتوں کی تاب لانے والے کہاں تھے۔ یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ جواہر لال کو جب غصہ آتا تھا تو غضب ہو جاتا تھا۔ انہوں نے مہاجن صاحب سے نہایت درشت لہجے میں کہا کہ پاکستان سے سمجھوتے کا شوق ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ پنڈت جی غصے میں ہی کچھ بڑ بڑاتے ہوئے شعلۂ جوالہ بن کر باہر آئے۔ میں نے پنڈت جی کو اس حال میں دیکھا تو ان سے وجہ دریافت کی پھر بڑی لگاوٹ سے میں نے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور ان سے کہا کہ یہ وقت خفا ہونے کا نہیں ہے بلکہ جلد از جلد اقدام کرنے کا ہے؛ اگر تھوڑی سی بھی تاخیر ہوگئی تو پھر نہ رہے گا بانس اور بجے گی بانسری، سانپ نکل جائے گا اور ہم لکیر پیٹتے رہ جائیں گے۔ میں نے پنڈت جی کو یہ اطلاع بھی دی کہ نیشنل کانفرنس کی تائید اس فیصلے کے ساتھ ہے، اس سے انہیں ایک گونہ اطمینان ہوا۔ وہ اندر گئے اور مہاجن صاحب سے کہا کہ آپ جو کہتے ہیں، وہی شیخ عبد اللہ کا بھی خیال ہے، اور اس طرح دستاویزِ الحاق پر دستخط کر دیئے گئے۔ مہاجن نے اس واقعے کے متعلق بعد میں لکھا، ایسے آڑے موقع پر شیخ عبداللہ کی مدد کا ہمیشہ ممنون رہوں گا، کیونکہ انہوں نے بروقت پیغام بھیج کر کشمیر کو پاکستان کے ساتھ جانے سے بچالیا۔''

تاریخ کے طالب کے لئے یہاں کچھ باتیں بہت اہم ہیں۔ اور آتشِ چنار کے قاری کو بھی ان پر غور کرنا چاہئے خاص طور سے اس لیے بھی کہ صاحب آتشِ چنار نے ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔